

NOVEMBER 2008

فخرا تہن اور دو شیراؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خاتونِ طلوع



قدرت کی ستم ظریفی تھی، یا پھر بزرگوں کا حسن
نظر ان کا سارا خاندان ہی ناموں کے سلسلے میں عجیب
وغریب تضاد کی شکار تھا، جن جن کے ایسے نام رکھے گئے
تھے، جن کا صاحب نام سے دور کا بھی رشتہ تو کیا، سرے
سے کوئی تعلق ہی نہیں بناتا تھا۔

خاندان کے سب سے زیادہ صاحب ثروت شخص
مسکین بھائی اور سب سے مفلوک الحال شاہ جہاں
چچا ان سے پہلے ان کے والد بزرگوار جو خاندان میں
جانے کس کس رشتے سے بہت سارے لوگوں کے
لگتے تھے، خود کو ساری عمر اکبر اعظم کہلوا یا۔

سارا دن اپنے خستہ حال ڈیڑھ کمرے والے گھر کے
آگے جھلنگا سی چارپائی ڈالے جس کی پائنتی کو پورا
کرنے کے لیے ہمیشہ پرانے ازار بندوں کا سہارا لیا۔

عالیہ تجاری



تھا، نیم دراز رہتے اور ذرا ذرا سی باتوں پر محلے والوں
لڑا کرتے، یا پھر ڈاک سے اپنے نام آئے خطوط پر
بلکہ حفظ کیا کرتے تھے۔

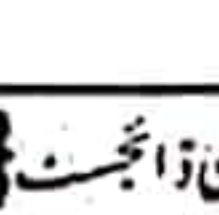
خاندان میں ابھی تک ٹل کلاس والی قدر
شرافت و مروت اور اخلاقی قدریں تھوڑی بہت
تھیں۔

بڑے ہونے کے ناتے انہیں منگنی بھادی، مہر
زندگی سے بڑے واقعات کی خبر دینا ہر ایک ہی
سمجھتا تھا۔

اس قبیل کے سارے لفافوں پر پہلی لائن
ایک ہی طرح شروع ہوتی تھی۔

بخدمت مہر و محترمی جناب اکبر اعظم
اعظم کا لاحقہ خوش قسمتی سے انہیں وراثت

بزرگوں کا حسن نظر



تھا۔ نثر سے بتاتے کہ والد محمد اعظم کے پاس میری
پیدائش کے وقت وہیں چوائس تھیں یا تو میرا نام اکبر
اعظم رکھا جاتا یا پھر سکندر اعظم۔

شکست کا تاج تو سر پر رکھا جاتا ہی تھا۔ چالیس دن
کے غورو فکر کے بعد اکبر اعظم پر دل جملا۔

”آدھا ادھورا ہی سہی، تھوڑا بہت تو مسلمان تھا
یہ، کیا خیر مرتے وقت کلمہ بھی نصیب ہو گیا ہو۔“

وہ اس طرح وضاحت دیا کرتے کہ جیسے یہ نام اختیار
کرنے سے ان سے زیادہ مغلیہ سلطنت کے وقار میں

اضافہ ہوا ہے۔

بہر حال سکندر اعظم کی عزت تو بچ ہی گئی۔
بات کہاں سے نکلی اور کہاں پہنچنے لگی وہ کھینچ تان

کر خود کو واپس لائے۔

انگوٹھا ابھی تک اسی پور پر جما ہوا تھا جس پر رک کر
شاہ جہاں سے اکبر اعظم تک کا سفر طے کیا تھا، پیدائشی

فلسفی تھے۔ اور خاندان میں اتفاقات کی اس ڈور کو اکثر

نیا دلچ

ہی بڑے شوق سے تپا کرتے۔

اور۔ اور۔

ساری عمر شکار پور سے قدم نہ نکالنے والے سفیر
الدین اور سالانہ کرائے کے گھریلے والے مقیم
ماموں ذرا ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کے لیے تیار
رہنے والے پیارے میاں بجن پر بہت دل کڑا کرنے
کے بعد بھی کسی کو پیار نہیں آسکتا تھا یا پھر وہ لوگوں کے
برابر جگہ گھیرنے والی نزاکت خالہ اور بے حد دھان پان
جسیم بھائی۔

ہریار کی طرح انگلی کی پوریں ختم ہو گئیں اور کتنے
ہی لوگ رہ گئے۔ ایسا نہیں تھا کہ انہیں اس سے آگے
کا حساب نہیں آتا تھا، مگر دل غ پر ضرورت سے زیادہ
نور ڈالنے کے حق میں نہیں تھے دل میں رہم سا بیٹھا
ہوا تھا کہ اور چیزوں کی طرح زیادہ خرچ کر دینے سے
ذہانت میں بھی کمی واقع ہو سکتی ہے۔

مچلی منزل سے اوپر والی منزل کی طرف جاتے ہوئے ہمیشہ نے حسبِ عادت ان کی خبر گیری کے لیے بھی اسی وقت اندر جھانکا تھا۔

جب وہ اس روز مرد والے تجزیہ کے بعد کچھ گم صم سی کیفیت میں بیٹھے تھے۔

”کیا ہوا منے پریشان کیوں ہو؟“

وہ مزید اوپر جانے کا ارادہ ترک کر کے تڑپ کر فوراً ہی اندر آ گئیں۔

”کچھ نہیں آیا! اور یہ مجھے منامت کہا کرو برا لگتا ہے۔“

”لگتا ہے تو لگے ہم تو منامی کہیں گے اور کون سا ہر وقت کہتے ہیں جس وقت زیادہ پیار آتا ہے۔ اسی وقت تو کہتے ہیں۔“

عجیب انداز بے نیازی تھا جس کے بعد بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی۔

”اور کہاں جا رہی ہو اس وقت۔“ وہ یوں ہی بات ٹالنے کے لیے پوچھنے لگے تو انہیں بھی اپنا ضروری کام یاد آیا۔

”اوپر شاگرہ کے پاس جا رہی تھی۔ ابھی ابھی شاہنگ کر کے واپس آئی ہے اور سیدھی اوپر چلی گئی میں نے آوازیں بھی دیں مگر مجال ہے جو رکی ہو نیچے۔ اب مجھے ہی اوپر دیکھنے جانا پڑے گا دیر ہو گئی تو آدھی سی زیادہ چیزیں چھپا دے گی۔“ انہوں نے بے تابی سے کہتے ہوئے پھر سے سیڑھیوں کا رخ کیا۔

”چھا میری ایک بات تو سنتی جائیں صابرہ آپا صابرہ آپا۔۔۔!“

وہ آواز ہی دیتے رہ گئے۔

مگر وہاں صبر کہاں۔

نام اور صفات کے تضاد کا یہ عجیب سلسلہ ان کے ہاں بھی پوری آب و تاب سے جاری تھا۔

صابرہ آپا اور شاگرہ آپا۔

دنیا کی ساری نعمتوں کو حاصل کرنے کے بعد بھی نہ وہ صابرین میں تھیں اور نہ وہ شاگرین میں۔



وہ ان دونوں سے بہت چھوٹے تھے۔

اور اتنے عرصے بعد اس غیر متوقع بہت بڑی خوشی کو بہت دھوم دھام سے منایا گیا تھا۔

صابرہ آپا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً ہی ان کا ہر کلام تجویز کیا۔

سارا دن شہزادی حسن آرا اور شہزادہ گلہام کی کہانیاں پڑھا کرتی تھیں۔

ان کی جگہ تیسری بہن آئی تو یقیناً ”وہ حسن آرا ہوتی۔“

سارے خاندان میں وہ خوشی خوشی گلہام ہی پکارے جانے لگے، اصل دھکا انہیں ہوش سنبھالنے کے بعد لگا تھا، جب ان کی گہری سانولی رنگت اور معمولی نقوش پر سچے گلہام نام کا بے تکلف دستار کے گروپ میں بنا کسی رعایت کے ریکارڈ لگنے لگا۔

ناموں کے اس گورکھ دھندے پر غور کرنے پر انہیں تب ہی سے عادت پڑی تھی، جس پر کبھی کبھی ہنسی آتی تھی اور کبھی کبھی رونا۔

اماں اب اتورے نہیں تھے، ایک آدھ بار بہنوں کے ساتھ اپنی الجھن کو شیر کرنا چاہا، تو انہوں نے سر سے توجہ ہی نہیں دی۔

”ناموں کا کیا ہے ایسے ہی رکھ دیے جاتے ہیں۔“

زبانے بھر میں آگے جا کر کس کو کیا بنتا ہے اس وقت تھوڑی ہوتا ہوا ہے، تم ایسی باوقل باتیں مت سوچا کر پڑا ہونے کے ناتے وہ اب تک انہیں ڈانٹ لیا کرتی تھیں، اور وہ سعادت مندی سے سن بھی لیا کرتے تھے۔

صابرہ آپا کے جانے کے بعد پھر سے وہی سناٹا چھا، جس سے اب دم سا گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔

گلہام ٹیرس پر چلے آئے۔ نیچے دونوں بہنوں نے بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔

”آجائیں ماموں!“ انہیں دیکھا تو ازراہ مٹون انہیں بھی مدعو کرنا چاہا، مگر وہ اس طرح کے بھاگ والے کھیلوں سے ہمیشہ ہی الگ رہے تھے۔

بچوں کو بھی پتہ تھا، سو ان کے منع کرنے پر

اصرار بھی نہیں کیا۔

”تم لوگ آجاؤ میں نے آئس کریم لا کر رکھی ہوئی ہے۔“

”رات میں آئیں گے ماموں! ابھی تو بڑا زبردست میچ ہو رہا ہے۔“

اب وہ بڑے ہو گئے تھے اور پہلے کی طرح آئس کریم چاکلیٹ وغیرہ کے لالچ میں فوراً ہی بھاگے بھاگے نہیں آتے تھے۔

مایوس سے ہو کر وہ پچھلی دیوار کے پاس آکھڑے ہوئے۔

سامنے نیلم کھڑی تھی۔

اپنی بالکونی میں رکھے پودوں کو پانی دیتے ہوئے وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے ایک ادا کے ساتھ مسکرائی تو جیسے ساری کوفت کا ایک پل میں ازالہ ہو گیا۔

”کیسی ہو؟“ فاصلہ زیادہ نہیں تھا مگر وہ مارے احتیاط کے ہمیشہ اشارے سے ہی پوچھا کرتے تھے۔

جواباً اس نے جس طرح ہاتھ ہلایا تھا اس سے کچھ ٹھیک ٹھیک اندازہ بھی نہیں ہو پایا۔

بے چین سے ہو کر وہ دوبارہ پوچھ رہے تھے لیکن اب وہ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ پوچھ رہی تھی۔

پتا نہیں کیا مطلب تھا۔

کچھ گڑبڑا کر انہوں نے اپنے کپڑوں پر نگاہ ڈالی، ٹیپس پر تانہ چوس کر کھائے گئے آموں کے رس ٹپکنے کے بڑے واضح نشانات تھے اور درمیان کا ایک بیٹن بھی ٹوٹا ہوا تھا۔

”میں دھو دوں۔“ نیلم اب مسکراتے ہوئے اشارے سے پوچھ رہی تھی۔

ان کی مسکراہٹ اب اتنی گہری ہو رہی تھی کہ باغچیں چیر کر کانوں سے لگی جا رہی تھیں۔ اتنی بے ادبی بھلا وہ کیسے کر سکتے تھے؟

جب وہ ان کی زندگی میں آجائے گی تو وہ اسے رانی بنا کر رکھیں گے، یہ نازک ہاتھ گھر کے بھاری بھر کم کاموں کے لائق تھوڑی ہیں۔ یہ بات وہ اسے کہنا

چاہتے تھے۔

مگر اشاروں سے ترجمانی کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ رانی کا اشارہ کرنے کے لیے اپنے سر پر تاج کا پوز بنایا تو وہ سمجھی کہ شاید سرور کی شکایت کر رہے ہیں۔

فوراً ہی گولی پھانکنے اور سو جانے کا مشورہ عطا ہوا۔ وہ کچھ کھیا سے گئے۔

اس سے تو ٹیلی فونک سلسلہ ہی بہتر تھا، کم از کم اس طرح کا کنفیوژن تو نہیں پیدا ہوتا تھا، دل کی بات کہہ دی اور سن لی جاتی تھی۔

سو اب وہ ٹیلی فون کرنے کا سگنل دے رہے تھے۔

نیلم سمجھی یا نہ سمجھی، لیکن بڑی تیزی سے پیچھے ہٹی تھی۔

وہ سمجھے کہیں ان کی کسی بات پر خفا ہو رہی ہے، عشق میں انسان ویسے بھی سب سے زیادہ وہم ہی پالتا ہے۔

بے تاب ہو کر دیوار پر اور بھی زیادہ جھک گئے ایک ہاتھ ریسیور کی صورت میں کان سے لگا ہوا تھا۔ اور دوسرا توبہ کے اظہار کے لیے دوسرے کان کی لو کو پکڑے ہوئے تھا۔

طبع محبوب کو دونوں ہی درخواستیں شاید نامنتظر تھیں، تب ہی وہ دوسرے ہی لمحے جھپاک سے اندر غائب ہو چکی تھی۔

وہ اسی پوز میں دیوار پر ٹنگے سا کن تھے۔ سامنے والی کالی میں نیچے میر صاحب، سر اوپر کیے جن نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کا مطلب سمجھنے کے بعد مرنے کے لیے چلو پھر پانی بھی کافی تھا۔

کان سے لگے دونوں ہاتھ ایک ایک کر کے پہلو میں آگئے۔

مارے شرم کے وہ ٹیرس تو کیا، لاؤنج میں بھی نہ رک سکے، سیدھے اپنے کمرے میں جا کر ہی دم لیا، آج جیسی شرمندگی پہلے بھلا کب اٹھانی بڑی تھی، اشارے بازی کا یہ سلسلہ وہ بڑی دیکھ بھال کے بعد شروع کیا کرتے تھے، مگر آج نہ معلوم کیسے عقل بالکل ہی ضبط

ہوئی تھی۔
 سلیم کے ساتھ یہ سلسلہ شروع ہوئے انہی چار ماہ
 ہی ہوئے تھے اور سلیم کے گھرانے کو پڑوس میں شفٹ
 ہوئے ساڑھے چار ماہ۔

انہی یہاں آمد کے پہلے پندرہ دنوں میں ہی سلیم نے
 اس شان دار تین منزلہ بنے گھر کے اکلوتے وارث کا
 نوٹس لیا تھا۔ اور پھر بات بڑھنے میں ذرا دیر نہیں لگی
 تھی۔

میر صاحب نہ جانے کب سے ٹاک میں تھے موقع
 ملا تو دیر نہیں کی۔

صابرہ و شاگرہ آیا کی بزم شوہر حضرات جنگامی میٹنگ
 اس رات کھانے کے بعد چلی منزل پر صابرہ آپا کے
 ڈرائنگ روم میں ہوئی۔

”آج میر صاحب نے کہا کل کو صدیقی صاحب
 کہیں گے اور پرسوں بیگ صاحب۔“

صابرہ کے میاں نے معززین محلہ کے نام گوائے
 ”کچھ اندازہ ہے آپ لوگوں کو کس درجہ ذلت کی بات
 ہے ہم لوگوں کے لیے کہیں منہ دکھانے کے قابل
 نہیں رہیں گے ہم اس محلے میں۔“

ان کے لہجے میں ایسی وحشت تھی جیسے معاملہ کسی
 سولہ سال کی دوشیزہ کے بگڑ جانے کا ہو۔

میر صاحب نے چغلی انہی سے لگائی تھی سوان کا
 سارا زور اس بے عزتی پر تھا جو میر صاحب سے یہ قصہ
 سنتے وقت انہوں نے جھیلی تھی۔

”نگاہ اٹھانی مشکل ہو گئی جب میر صاحب نے کہا
 کہ آج آپ کی بچیاں چھوٹی ہیں کل کو بڑی ہوں گی تو
 یہ وقت آپ پر بھی آسکتا ہے عزت تو سب کی سا بھی
 ہوتی ہے۔“

تھوڑی ہی دیر میں وہ کئی بار یہ بات کہہ چکے تھے
 ”اب اس بات کو چھوڑیں سوچنا یہ ہے کہ اب کرنا
 کیا ہے اس معاملے سے کیسے نمٹا جائے آخر؟“
 چھوٹے بہنوئی بار بار کی تکرار سے بور ہو چکے تھے
 انہیں نیند بھی جلدی آتی تھی اور ابھی تین زینے چڑھ
 کر اوپری منزل تک جانا بھی باقی تھا۔

”کرنا کیا“ میں کل خود جا کر تسلیم کی ماں کی طبیعت
 صاف کروں گی اپنی بیٹی کو سنبھال کر رکھیں ہمارے
 بھولے بھالے بھائی کو اپنے جال میں پھنسا رہی ہے۔“
 صابرہ آپا تڑپ کر بولیں۔

”پھنسا رہی ہے یا پھنسا چکی ہے پہلے گلفام سے
 تو کفرم کریں۔“

چھوٹے بہنوئی وہی دل جلاتی ہنسی خنہ جس کے
 لیے وہ خاندان بھر میں بدنام تھے۔ خود ان کی بیوی کو بھی
 اس وقت بے حد برا لگا۔

”ہمارا بھائی ایسا نہیں ہے چھوٹے سے بڑا ہوا ہے
 اس محلے میں کبھی کسی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔“
 ”پہلے سلیم کا گھرانہ نہیں تھا یہاں۔“ وہ پھر سے
 ہنستے۔

”ہاں تو ثابت ہوا تاکہ اس لڑکی نے ہی یہاں آکر
 ماحول خراب کیا ہے۔ میرے سیدھے سادے بھائی
 کو بگاڑنے والی وہی ہے۔“

بحث میں گرما گرمی پیدا ہونے لگی تھی۔ بڑے
 بہنوئی نسبتاً معقول تھے تھوڑی ناگواری سے ان
 لوگوں کی طرف دیکھا اور بولے۔

”کوئی کسی کو نہیں بگاڑ سکتا جب تک وہ خود بگڑنے
 کے لیے تیار نہ ہو تالی دونوں ہاتھ سے بچتی ہے آپ
 لوگ گلفام کو سمجھائیں جب ہمت افزائی نہیں ہوگی
 تو وہ خود ہی پیچھے ہٹ جائے گی کسی کے گھر ورنے کی
 ضرورت نہیں ہے۔“ بحث سمیٹنے کی وجہ سے سب ہی
 کو ان کی تجویز پر متفق ہونا پڑا۔

دونوں بہنوئی تو سونے کے لیے فوراً ہی چلے گئے۔
 صابرہ اور شاگرہ آپا درمیانی منزل کی سیڑھیوں پر کھڑی
 بہت دیر تک اسی مسئلے کو لے کر مصروف رہیں۔

طے ہوا کہ کل ہی دونوں ایک ساتھ گلفام سے
 بات کریں گی۔

لیکن وہ اگلا دن کئی دن تک نہیں آسکا۔ گلفام
 یکایک بہت مصروف ہو گئے۔
 آفس سے دیر سے آرہے تھے
 دوسرے کا کھانا گول۔

شام ڈھلے جب گھر آتے تو وہ دونوں بھی اکثر اسی وقت کہیں تا کہیں کے لیے نکلی ہوئی ہوتیں، اتنا بڑا خاندان، میل ملاقات، دس مواقع ہر وقت دستیاب رہتے تھے۔

رات کو وہ پھر کہیں تا کہیں چلے جاتے، یا پھر سخت تھکن کا کہہ کر جلدی سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔

میرس پر البتہ وہ اس دن کے بعد نظر نہیں آئے تھے۔ اوپر والی شاگرہ آپا وقتاً فوقتاً جھانک کر سلیم کی اپنی چھت یا صحن میں موجودگی کا کئی بار نوٹس لیتی تھیں، سو وہ انہیں دس میں سے نو بار ضرور ہی کھڑی ملتی۔

دراز قد، گلابی رنگت، لمبے بال، اور سب سے بڑھ کر جوانی کی اپنی سحر انگیزی۔

دھلے ہوئے کپڑے، نچوڑتے، جھٹکتے ہوئے، صحن کے فرش کو دھوتے ہوئے وہ کچھ ایسے بھید بھاؤ دکھاتی کہ خود انہیں بھی کسی کسی وقت دل اچھل کر حلق میں آتا محسوس ہوتا۔

چند بار نیچے سے بڑی ہمشیرہ کو بلا کر خصوصی طور پر یہ نظارہ بھی کرا دیا۔

دونوں کو اپنی اب تک کی بے خبری پر افسوس ہوتا تھا۔

گھر کی دیوار تلے دلی چنگاری، شعلہ بننے کے لیے بالکل تیار تھی۔

بڑے شہروں کی روایتی بے نیازی بلکہ سرد مہری کے طفیل، ابھی تک سلیم کے گھر والوں سے دعا سلام کا بھی سلسلہ نہیں شروع ہوا تھا، سو ان کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ سلیم سے چھوٹی دو بہنیں اور ایک بھائی صبح کا ج یا پھر یونیورسٹی جاتے دکھائی دیتے تھے، یا پھر ہفتے میں ایک دو بار اس کی دو بڑی بہنیں رکشاؤں میں اپنی سرال سے آتی نظر آتیں۔ اپنے بال بچوں کے ساتھ خوب فیشن کیے ہوئے۔

”ساری کی ساری ایک جیسی ہیں چالاک چلتے، لگتا ہے ایسی اداؤں سے ہی لڑکے پھنسا کر شادی کی ہے

سب نے۔“

دونوں بہنوں کی متفقہ رائے اس گھرانے کے بارے میں خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔

ان ہی دنوں محلے کی ایک میلاد میں سلیم اور اس کی انی سے سامنا ہوا تو پہلی بار دونوں بہنوں نے اسے قریب سے اور غور سے دیکھا تو انکشاف ہوا کہ کنبخت کی آنکھیں بھی نیلا ہٹا مل ہیں۔

”ایسی آنکھیں کبھی وفا نہیں کرتیں، یہ بات تو ثابت ہے۔“

صابرہ آپا نے کہیں کی سنی سنائی بات کو کلیہ بنا کر سرگوشی میں پیش کیا۔

سامنا ہونے پر سلیم نے خوش اخلاقی سے ان دونوں کو سلام بھی کیا تھا مگر دونوں ہی نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تو وہ بھی ایک طرف ہو کر بیٹھی رہی۔

میلاد کے بعد جب کھانا کھایا جا رہا تھا اور پوری طرح ایک بار پھر ساری خواتین دنیا داری کی باتوں میں محو ہو چکی تھیں۔

میر صاحب کی بیگم ان دونوں بہنوں کو ایک کونے میں پلیٹیں سنبھالے کھڑا دیکھ کر ان کی طرف کھسک آئیں۔ دونوں نے ہی ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہ سے دیکھا، یہ آمد بے سبب نہیں تھی۔

”اچھے لوگ آئے ہیں تمہارے پڑوس میں، میں ایک دوبار ہو کر بھی آتی ہوں، اچھے خاندانی لوگ ہیں۔“

تھوڑی سی دیر میں ہی وہ اصل بات پر آگئی تھیں۔ اور صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس خاندان کے لیے سو فٹ کارنر رکھتی ہیں۔

جب یہ تعریفی پیرا گراف لمبا ہونے لگا تو انہیں ٹوکنا پڑ گیا۔

”خاندانی لڑکیوں کے یہ انداز نہیں ہوتے۔ فلمی اور چھپھورے۔“

”انداز“ کی تفصیل میں جانے کے بجائے شاگرہ نے وہی الفاظ میں وضاحت کی۔

”حیثیت کوئی چیز نہیں ہوتی آپا! اصل چیز انسان کی شرافت اور سمجھ داری ہوتی ہے۔“
 شرافت پر تو وہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتی تھیں، لیکن ”سمجھ داری“ حلق سے نہیں اتر کر دے رہی تھی۔

”کیا سمجھ داری دکھائی دے گئی ہے تمہیں اتنی دور بیٹھے بیٹھے۔“

صابرہ آپا کے لہجے کی کڑواہٹ کو محسوس کرنے کے باوجود بھی وہ دھیرے سے مسکرا دیے۔

”یہی سمجھ داری دیکھ لیجیے کہ ان کے ہاں ہماری طرح کے بے تکے نام نہیں ہیں۔ نیلم کا نام اس کی شخصیت پر کیسا چلتا ہے۔“ بات مکمل کرتے ہوئے وہ کھوسے گئے۔

نیلی جھیل سی آنکھوں کے سحر سے لکنا اب شاید ان کے بس سے باہر ہو چکا تھا۔

دونوں ناکام سی ہو کر اٹھ آئیں۔ شوہروں سے یہ بات چھپانا مشکل بلکہ غیر ضروری بھی تھا۔ کوئی حل باہم مشورے سے ہی نکل سکتا تھا۔

”گویا شہزادہ گلغام نیلم پری کی محبت میں واقعی گرفتار ہو چکے ہیں۔“

چھوٹے بہنوئی کی وہی بدنام زمانہ ہنسی! مگر کوئی بھی اس بے تکے بات پر نہیں مسکرایا۔

”یہ بات آپ سب اچھی طرح سمجھ لیں اس لڑکی کا یہاں آنا ہم سب پر ہی بھاری پڑے گا وہ یہاں آگئی اور ہم سب کا ہاتھ صاف ہوا یہ میں ابھی بتا رہا ہوں۔“

جس بات کا اب تک پورے فسانے میں کوئی ذکر نہیں آیا تھا بڑے بہنوئی صاحب اس نکتہ کو اٹھا رہے تھے۔

ذرا دیر کے لیے تو سب ہی دم بخود سے ان کی شکل دیکھنے لگے۔

سالوں سے اپنے اپنے قلیٹ کرایے پر دے کر دونوں بہنیں بھائی کی خبر گیری کے خیال سے چلی اور اوپری منزل میں معیم تھیں، ایک اچھی بھلی اضافی

اور یہ سوچنا تو فضول ہی تھا کہ میر صاحب نے اس دن کے سنسنی خیز واقعہ کو اپنی بیگم سے چھپا رکھا ہوگا۔
 ”فیشن تو خیر سب ہی لڑکیاں کرتی ہیں میں تو تمہارے بھلے کامشورہ دے رہی تھی جب لڑکا اور لڑکی

راضی ہیں تو پھر دیر کس بات کی ہے؟“
 وہ طنزیہ انداز میں بات مکمل کر کے کسی دوسری خاتون کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔

دونوں بہنوں کے لیے کھانا ختم کرنا مشکل ہونے لگا ایسا لگ رہا تھا جیسے میر صاحب کی بیوی محلے کی ہر خاتون کو یہی قصہ سنارہی ہیں اور ہر ایک ان دونوں ہی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ پلٹیں ایک طرف رکھ کر خاتون خانہ سے اجازت لے کر وہ دونوں گھر آئیں تو سیدھی

اوپر گلغام کے کمرے میں ہی پہنچیں۔
 وہ آرام سے کرسی پر نیم دراز نہ جانے کس دھیان میں تھے۔ لبوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ٹھہری ہوئی چمک دونوں بہنوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی۔

”خاندان میں ملنے والوں میں کئی لڑکیاں ہیں جہاں کو وہاں بات چلاتے ہیں مگر یہ لوگ ٹھیک نہیں ہیں۔“ بنا کوئی لمبی چوڑی تنہید باندھے وہ فوراً ہی اصل بات پر آئیں مقصد انہیں کم سے کم ٹائم دینا تھا تاکہ دیاؤ برقرار رہ سکے۔

مگر بات خاصی بڑھ چکی تھی۔
 ”مجھے نیلم ہی پسند ہے آپا! میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں۔ آپ کو میری خوشی چاہیے تو اس کے گھر جا کر بات کریں۔“

وہ اتنے قطعی لہجے میں کہہ رہے تھے کہ دونوں بہنوں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”دیکھو منے! ان کا خاندان ماحول ہم سے بالکل الگ ہے حیثیت میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔“

سارے وہی روایتی سے الفاظ اور جملے جو ایسے موقعوں پر سمجھانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اور ان کا وہی پکے عاشقوں والا جواب۔

”وہ اتنے قطعی لہجے میں کہہ رہے تھے کہ دونوں بہنوں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔“

”دیکھو منے! ان کا خاندان ماحول ہم سے بالکل الگ ہے حیثیت میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔“

سارے وہی روایتی سے الفاظ اور جملے جو ایسے موقعوں پر سمجھانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اور ان کا وہی پکے عاشقوں والا جواب۔

”وہ اتنے قطعی لہجے میں کہہ رہے تھے کہ دونوں بہنوں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔“

”دیکھو منے! ان کا خاندان ماحول ہم سے بالکل الگ ہے حیثیت میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔“

سارے وہی روایتی سے الفاظ اور جملے جو ایسے موقعوں پر سمجھانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اور ان کا وہی پکے عاشقوں والا جواب۔

آمدنی آرہی تھی۔

”پہلے ہی ہم سب کے خرچے بڑھ رہے ہیں اور منگائی ہے کہ ہوش اڑائے دے رہی ہے، ایسے میں اگر یہ کرائے کا سہارا بھی ختم ہوا تو پھر سوچ لو کہ گزارے کی صورت کیا ہوگی۔“

بڑے بہنوئی تھے کہ دہلائے دے رہے تھے۔ اخراجات کب کے ایک لگی بندھی تنخواہ کے دائرے سے کہیں دور نکل چکے تھے، کھینچ تان کر بھی برابر کیا جانا ناممکن تھا۔

صابرہ آیا کا بڑا بیٹا اس سال فرسٹ ایر میں آیا تھا اور بیٹی نویں کا امتحان دے رہی تھی، اس سے چھوٹی ساتویں میں تھی۔

شاکرہ آیا کے بیٹا بیٹی اولیول کر رہے تھے۔ فیس، ٹیوشنز، کتابیں، دین کا کرایہ اور دیگر اخراجات۔

کل ملا کر آدمی سے زیادہ تنخواہیں تو ان ہی کی نذر ہو جاتی تھیں۔ جو یہ کرائے کا آسرا چھی جاتا رہتا تو پھر تو نہ جانے کیا بنتا تھا۔

”گلفام کی آنکھوں پر تو پٹی بندھ ہی گئی ہے، یہ لڑکی تو پوری طرح چھا جائے گی میکے والوں کی حالت پہلے ہی کمزور ہے، وہ ہمیں یہاں سے چلتا کر کے دونوں منزلوں میں اپنی ماں اور بہنوں کو لا بٹھائے گی۔“ جس طرح کی منظر کشی وہ کر رہے تھے، اس کو شرمندہ تعبیر ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں لگتی تھی اگر۔ گلفام بھیا کی ضد پوری کر دی جاتی۔

اور ایک بے وقوفانہ ضد کو پورا کر کے اپنے بھائی کی زندگی برباد کرنے میں ان دونوں میں سے بلکہ ان چاروں میں سے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔

اگلے چند دن بڑے غضب کے معرکے ہوئے۔ حالانکہ اپنی بہنوں کے مقابلے میں تو وہ کہیں کم گو، بلکہ ایک طرح سے گونگے ہی تھے، مگر اپنی بات منوانے کے لیے زیادہ الفاظ کی نہیں، بلکہ ارادے کی مضبوطی درکار ہوتی ہے۔

جوان کے پاس بد درجہ اتم موجود تھی۔

”فیصلہ تو میں کر چکا ہوں، آپ لوگوں کی رضامندی حاصل ہوگئی تو خود کو خوش قسمت سمجھوں گا۔“ ورنہ۔

ان کے انداز میں دن بہ دن بے نیازی بڑھتی جا رہی تھی۔

دونوں بہنوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس چپ چپاتے شرمیلے بھائی کو جو آج بھی خاندان کی بیشتر لڑکیوں کو نہیں پہچانتا تھا، کو یہ انداز آئے تو کہاں سے ڈانٹ پیار، خفگی، چیخ و پکار سب ہی کچھ تو کر کے دیکھ لیا۔ وہ پرسکون سے انداز میں بیٹھے سنا کرتے مگر حرف آخر وہی تھا۔

نیلیم!

”گلفام! آپ کی بہنیں مجھے پسند نہیں کرتیں۔“

مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ آپ کے گھروالے مجھے قبول نہیں کریں گے۔“

ان لوگوں کی طرف سے مستقل تاخیر پر اس روز بڑے سوچے سمجھے انداز میں اواس تھی۔

ٹیلی فون کے دوسرے سرے پر وہ جیسے تڑپ کر رہ گئے۔ ابھی تک گھر میں ہونے والی کھلی جنگ سے نیلیم کو آگاہ نہیں کیا تھا، بس یوں ہی ٹالم ٹولی کام چلا رہے تھے۔

”ایسی بات نہیں ہے نیلیم! وہ لوگ خود آئیں گی، بس تھوڑے دن کی بات ہے۔“

”مہینے سے اوپر تو ہو گیا ہے آپ کو یہی کہتے ہوئے، بے کار میں کیوں بہانے بنا رہے ہیں، جو سچ ہے وہ کہہ دیں، میں اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لوں گی۔“

اس کی ٹھنڈی آہذریعہ فون انہوں نے ریسو کی۔

”ایسی باتیں مت کرو نیلیم! دیکھتا میں بس جلد ہی کچھ کر لوں گا، تم اپنے آپ کو سنبھالو اور بس۔“

”اور تم اپنی بہنوں کو؟“ دوسری طرف اس نے دل ہی دل میں کہا۔

آج سارا خاندان ہی کسی شادی میں گیا تھا، واپسی

معلوم نہیں کب تک ہونا تھی۔

گلفام اپنی منزل کی ساری روشنیاں بجھائے ہنوں
سے آخری بار بات کرنے کے منصوبے بناتے رہے کہ
اس یار بھی نہ مانیں تو وہ خود نیلم کی والدہ کے سامنے
دست بستہ حاضر ہو جائیں گے۔

اگلے دن وہ آفس سے مقررہ وقت سے کافی پہلے
اجازت لے کر اٹھ گئے۔

دوپہر سہ پہر میں بدل رہی تھی جب وہ گھر میں
داخل ہوئے۔ بات چونکہ بڑی بہن سے ہی کرنی تھی
سو وہ نیچے ہی رک گئے۔

بڑا سانی بوی لاؤنج خالی پڑا تھا۔

دبے پاؤں گزرتے ہوئے وہ صابرہ آپا کے کمرے کی
طرف بڑھ گئے۔

تب ہی بند دروازے کے دوسری طرف ہنسی کا ایک
نوارہ سا پھوٹا۔

”توبہ ہے ان بچوں سے“ کیسی دور کی کوڑی لاتے
ہیں۔ ”یہ شاکرہ آپا تھیں۔“

اور اندر سے جتنی ملی جلی آوازیں آرہی تھیں وہ
ساری ہی بے حد مانوس تھیں ”گلفام کے قدم وہیں
تھم گئے۔“

”کوئی غلط تھوڑی کہہ رہے ہی خالہ جان! بڑا ہی
مزاحیہ منظر ہوگا“ آپ ہی لوگوں کی ہمت سے جو ایسے
حالات کو بھی فیس کریں گی۔ میں تو بابا شریک بھی نہیں
ہوں گا۔“

صابرہ آپا کا بڑا بیٹا ہنستے ہوئے کئے جا رہا تھا، معلوم
نہیں کس کی ہنسی اڑائی جا رہی تھی۔

”میں بھی کسی دوست کو نہیں بلاؤں گی مذاق اڑا اڑا
کریا گل کر دیں گی اور ماموں کو خود شرم نہیں آرہی کہ
وہ کتنے عجیب سے لگیں گے نیلم باجی کے ساتھ اتنے
کالے سیاہ اور وہ ایک دم سفید گلابی۔!“

صابرہ آپا کی بڑی بیٹی۔
”بالکل دن رات کا کبھی نیشن ہوگا“ نیلم باجی کی

ہمت ہے جو وہ ماموں سے شادی پر راضی ہیں۔“
الفاظ تھے کہ تیر، ٹھک سے اگر ان کے دل میں
پیوست ہوئے وہ سن سے وہیں کھڑے رہ گئے۔
”وہ تمہاری کہاں سے نیلم باجی ہو گئیں“ خبردار جو
زیادہ بے تکلفی بڑھائی۔ ”اندر صابرہ آپا بچوں پر غصہ
کر رہی تھیں مگر ہنسی تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے
رہی تھی۔“

یہ وہ بچے تھے جنہیں انہوں نے گودوں میں کھلایا تھا
اور جن کی ناز برداری کے لیے وہ آج بھی ہر وقت تیار
رہتے تھے۔

اندر جانے کے بجائے وہ واپس مڑ آئے۔ اور اگر
انہوں نے کمرے کا دروازہ لاک کیا ”اپنا سیل فون آف
کیا“ بی بی سی ایل والے نمبر کو انگلیچ کیا ”اور بنا کپڑے
تبدیل کئے کرنے کے سے انداز میں بستر پر جالیٹے
خاموشی تنہائی۔“

چھت پر نگاہ جمائے وہ جانے کیا کیا سوچا کیے
آنسوؤں کی ایک تلی سی لکیر ان کی آنکھوں سے بہہ کر
ہلکے کو گیلہ کرنے لگی۔

اپنی اماں کے انتقال کے بعد وہ اس روز پہلی بار
روئے اور دل بھر کر روئے۔

ان کی زبان پر پھر نیلم کا نام کسی نے نہیں سنا۔
دونوں بہنیں منتظر ہی رہیں کہ اب اگلا معرکہ ہو، مگر وہ تو
جیسے اس ذکر کو بالکل بھول بھال گئے۔

اتنے شدید اصرار کے بعد بالکل ہی پہلو تھی کر جانا،
بڑی ناممکن سی بات تھی کسی کے بھی حلق سے نہیں
اتر رہی تھی۔

دونوں بہنوں کا خیال تھا کہ شاید وہ نیلم سے
کورٹ میج کر چکے ہیں اور کسی بھی دن اس کا ہاتھ
پکڑ کر گھر لے آئیں گے۔

کئی دن اسی خیال سے بڑی سنسنی پھیلی رہی، گلفام
کے آنے جانے کے اوقات سے لے کر نیلم کی اس
کے گھر میں موجودگی تک کو چیک کیا جاتا رہا۔

صابرہ کے میاں تو آفس تک جا کر بھی اطمینان کر
آئے تھے کہ آیا وہ آفس میں ہی ہوتے ہیں یا چھٹی لے

کر کہیں چلے جاتے ہیں۔
لیکن کوئی سراغ مل کے نہیں دیا۔

دو ماہ بعد جس دن نیلم کے گھر سے اس کی بات ملے
ہونے کے لٹو آئے اس روز اس غبارے سے بھی ہوا
نکل گئی۔

چند لمحوں کے لیے تو دونوں بہنوں کو بھی ملال سا
ہوا۔ مگر ”اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔“ کہہ کر
آسانی سے بری الذمہ بھی ہو گئیں۔

نیلم کے گھر سے آئے لٹو گلفام سے خاص طور پر
چھائے گئے تھے۔

مگر اگلے ہی ماہ جب اس کے گھر پر آرائشی بتیاں
جگمگائیں اور

”لے جائیں گے“ لے جائیں گے دل والے
دلہنہا۔“ جیسے گانوں کی دن بھر ریکارڈنگ کا سلسلہ
شروع ہوا تو یہ راز بھی کھل گیا۔

دونوں بہنوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی منتر
کسی جادو کے بل پر وہ نیلم کا گھر ہی یہاں سے غائب
کر دیں یا پھر اپنا دولت کدہ ہی کہیں اور شفٹ کر دیں
مگر ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوا۔

رخصتی والے دن ٹھیک گھر کے سامنے ہی
شامیانے لگے اور دیگوں کے کھڑکنے کے ساتھ
گاڑیوں اور مہمانوں کا ملا جلا شور، آدمی رات تک گلی
میں مچا رہا۔

گلفام اس رات بہت جلد سونے کے لیے چلے
گئے تھے۔ بچے کئی بار کھانے کے لیے بلائے گئے مگر
انہوں نے منع کر دیا تھا۔ خود دونوں بہنوں کی تو ہمت ہی
نہیں ہوئی کہ وہ انہیں اصرار کر کے بلا سکیں۔

درمیانی منزل، گلی میں بچی رونق سے بالکل بے نیاز
اندھیرے اور خاموشی میں ڈوبی رہی قصہ کتنا بھی سنسنی
خیز ہو، دوسرے دن پرانا ہوتا ہے۔

نیلم بھی چند مہینے بعد گئی گزری بات بن گئی۔

مگر اب اتنا ضرور ہوا تھا کہ صابرا اور شاکرہ دونوں
تباؤں کو شدت کے ساتھ یہ احساس ہونے لگا تھا کہ
گلفام کے لیے اب ایک مناسب جیون ساتھی، جلد

سے جلد تلاش کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

ورنہ کیا خبر، پھر کوئی نیلم پر نہ سہی، سبز پری یا لال
پری اپنی اداؤں میں الجھالے۔
شہر میں حسیناؤں کی کیا کمی ہے۔

اس بار تو اللہ نے بڑا کرم کیا تھا، دوبارہ ایسی صورت
حال بنی تو نہ جانے کیا نتیجہ نکلے۔

کسی غریب مسکین مگر خاندانی لڑکی کی تلاش بڑے
شدود کے ساتھ شروع ہوئی، ایسی جس کے ساتھ
رشتوں کے نام پر بس چند گئے چنے ہی لوگ ہوں۔

”ایسی لڑکیاں ساری عمر احسان مند رہتی ہیں“ اور

بھائی تو ہمارا ہے ہی لاکھوں میں ایک، فرمانبروار اور محبت
کرنے والا، دیکھا نہیں کیسے ہمارے منع کرنے پر وہ
نیلم سے بھی دست بردار ہو گیا، ورنہ اس کج بخت نے تو

کون سی کسر چھوڑی تھی۔“

کسی وقت نیلم کے قصہ کو اپنی جیت کے ضمن میں

فخریہ طور پر یاد کر لیا جاتا تھا۔

مگر عجیب سی بات تھی۔

جہاں ایک زمانے کو مناسب، صاحب حیثیت

گھرانے کی لڑکی نہ ملنے کی شکایت رہتی ہے۔

انہیں ان سارے گنوں سے عاری لڑکی نہیں مل کر

دے رہی تھی۔

اگر جو کوئی خاندانی غریب لڑکی دکھائی بھی دے جاتی

تو اس کے ساتھ بہن بھائیوں، چچا، تایوں کی اتنی لمبی

لائن ہوتی کہ وہ لوگ دیکھ کر ہی بولا جاتیں۔ ”اتنے

بڑے خاندان، اگر دو دو لوگ بھی ان کے ہاں سے روز

آئیں گے تو پورے مہینے بھی کسی دوسرے کی باری

نہیں آنے والی۔“

رہے گلفام، تو انہوں نے تو جیسے زندگی کی کتاب

سے یہ ورق ہی پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔

ذرا بھی ایسا کوئی ذکر نہ آنے دیتے جس سے اندازہ

ہو ماکہ وہ گھر سامنے کے ذرا بھی آرنڈ مندر رہے ہیں۔

تب ان ہی دنوں خاندان میں اچانک ہی ایک خبر

بڑے دکھ بھرے انداز میں سنی گئی۔

شاہ جہاں چچا کی بہن، پشاور میں وفات پا گئیں۔

بے چاری کب سے وہاں مقیم تھیں۔ کئی کئی سالوں میں کراچی آنا ہوتا، خاندان میں کسی سے ملاقات ہوتی کسی سے نہیں، سو فیوض سے خود بخود ہی محو ہوتی چلی مٹی تھیں۔

سب اتنا ضرور جانتے تھے کہ جو مفلسی وہ اپنے غلہ یاد سے جڑے میکے سے لے کر گئی تھیں۔ وہی سہاں میں بچن مقدر رہی ہوگی اور کھٹو شوہر تو بھائی ابا اپنا عیب اپنی ساری زندگی جھیل کر وہ وہیں پڑور کی خاک کارزن بنیں اپنے پیچھے ایک مٹی چھوڑی تھی۔ جس جس نے بھی سنا افسوس کے ساتھ ساتھ ان کی آزمائش ختم ہونے کی نوید بھی سنائی۔

صابرہ اور شاکرہ تپاؤں کو بھی طویل عرصے بعد نور جہاں پھوپھی کی تعزیت کے لیے اس منتہ حال ڈیرہ کمرے والے گھر جانا پڑا۔

اکبر اعظم اپنی اسی جھانگاسی چارپائی پر میلے چیکٹ کاؤتیکہ پر کھنٹی کے سہارے بیٹھے آنے والوں سے تعزیت وصول کر رہے تھے۔

چارپائی دھوپ کی شدت کی وجہ سے گلی کے بجائے مین کی چھت والے برآمدے میں پکھی ہوئی تھی اور اس پونے چار بجتے سے یہ چھوٹا سا برآمدہ بری طرح دھک رہا تھا۔

شکر تھا کہ وہاں ویسا روایتی ساراش نہیں تھا۔ ایک تو جائے وقوعہ یہاں سے بہت دور تھا اور دوسرے مرحومہ کی اہمیت بھی ایسی نہ تھی کہ لوگ اشتیاق سے دوڑے چلے آتے۔

وہ دونوں بھی مارے موت کے رسا ہی آئی تھیں اور آج کے دور میں کوئی اتنی تکلیف بھی بھلا کہاں اٹھاتا ہے۔

دونوں بہنوں نے اپنے پسینے سے تر ہوتے چروں کو لان کے نرم و ملائم قیمتی دوپٹوں کے پلو سے خشک کیا اور اکبر اعظم نے مسلسل کرتے آنسوؤں کو کرتے کے دامن سے، جس میں باریک باریک کتنے ہی سوراخ ہو چکے تھے۔

”صبر کریں بڑے لبا! نور جہاں آپ کی زندگی اتنی ہی

تھی۔ اللہ کی مرضی کے آگے کس کا زور چلتا ہے۔“ صابرہ آواروایتی جملوں کا پیرا گراف بڑھے گئیں۔ اکبر اعظم کو اللہ کی مرضی کا یقین کر کے بھی صبر نہیں آ رہا تھا۔

نور جہاں کی موت اللہ کی مرضی سی، زندگی بھر وہ جس رونخ میں جلسیں کیا وہ بھی خدا کی مرضی ہی تھی؟ اس پر بہت چاہنے کے بعد بھی دل یقین کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔

چھوٹے بڑے ان گنت دکھ، جنہیں تھوڑی سی محبت تھوڑی سی توجہ سے ختم کیا جاسکتا تھا، وہ بھی ہناسور بن کر ساتھ ہی چلے گئے تھے۔

سارا رونا نور جہاں کا نہیں تھا۔

ان دکھوں کا بھی تھا، جو اللہ کی مرضی کے بجائے اپنوں کی بے حسی کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوئے تھے۔ شاہ جہاں چچا کی بیوی، جوان سے عمر میں تھوڑی ہی بڑی تھیں، اور انہیں سارا خاندان محض بھالی ہی کہا کرتا تھا، چھوٹی چھوٹی سستی سی پالیوں میں ان کے لیے کم دودھ اور کم چینی کی چائے بنا کر لے آئی تھیں۔

”اس کی کیا ضرورت تھی بھالی!“ دونوں بہنوں کے منہ سے ایک ساتھ ہی نکلا۔

”ارے کیا، کچھ بھی تو نہیں،“ وہ شرمندہ سی ہو کر ایک طرف بیٹھ گئیں۔

زرد رنگت، کمزور۔

”اور جو چیک اپ کرایا جائے تو اس عورت کو دو چار بیماریاں تو ضرور ہی تشخیص ہو جائیں۔“

شاکرہ تپا کے دل میں بے اختیار ہی خیال آیا۔ یہ دکھتا ہوا برآمدہ۔

اکبر اعظم اور بھالی کے کمزور وجود۔

شکستہ حال درو دیوار۔

رنگت اڑے کپڑے۔

بے سستی سی پالیاں اور یہ چائے۔ یہاں ہر چیز میں مفلسی کا گہرا نال میل تھا۔

”آپ نہیں گئیں پشاور؟“

خیالات کی رو کو جھٹکنے کے چکر میں شاکرہ ایک

ہے وقوفی بھرا سوال کر بیٹھیں۔

صابرہ آپا تک نے گھور کر انہیں دیکھا تھا۔

”نہیں، دونوں کا جانا تو مشکل تھا ناں، مہینے کی آخری تاریخیں، پھر اتنی دور کا جانا، بہت خرچا ہو جاتا ہے۔“

بچی آواز میں جواب دیتے ہوئے وہ اتنی شرمندہ نظر آرہی تھیں جیسے ان سارے حالات کی خود ہی ذمہ دار ہیں۔

اکبر اعظم نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر سر جھکالیا، کیسے ظالم لفظ تھا۔ ”خرچہ“

اسی خرچے کے خوف سے ان کی معصوم بیٹی پچھلے پچیس چھیس سالوں میں محض چند بار ہی ان سے ملنے آسکی تھی۔

”اب تو چار سالوں سے اسے دیکھا تک نہیں۔“ انہوں نے جیسے اپنے آپ سے ہی کہا۔

”کچھ کہہ رہے تھے بڑے ابا!“ صابرہ آپا نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے ہلکے سے نفی میں سر ہلادیا۔

اب ان باتوں میں رکھا بھی کیا تھا۔ شاہ جہاں چچا کی بیوی بتا رہی تھیں کہ پچھلے دنوں میں چچا کا کام کتنی بار چھوٹا اور کتنے ہی دن وہ بیماری کی وجہ سے کام پر نہ جاسکے۔

اعصاب کو ان دیکھے بوجھ تلے دبا تا یہ ماحول اور یہ سارے ٹینشن بھرے قصے، دونوں بہنوں نے چائے کی پیالی ختم کرتے ہی اٹھنے کا ارادہ کر لیا۔

”آئی جلدی، کتنے عرصے بعد تو آئی ہو۔“ اکبر اعظم بڑی ناامیدی سے انہیں دیکھنے لگے۔

”پھر آئیں گے بڑے ابا!“ ”چھا! نہیں یقین آیا تھا بھی یا نہیں۔“

سروں پر ہاتھ پھوڑا کر وہ دونوں گھر سے باہر نکل آئیں، شاہ جہاں چچا کی بیوی ان کے ساتھ باہر تک آئیں۔

دونوں بہنوں نے آنکھوں آنکھوں میں کچھ طے کیا اور پرس میں سے ایک ایک نیلا نوٹ نکال کر ان کی

مٹھی میں دبا دیا۔

”نہیں نہیں اللہ کے واسطے یہ مت کرو۔“

وہ شرم سے پانی ہوئی جا رہی تھیں۔ اپنی مصیبتوں کے قصے کوئی اس نیت سے تھوڑی سنائے تھے جس سے دل کا بوجھ ہی تو ہلکا کیا تھا۔

بچوں میں سے کسی ایک نے ٹیکسی لا کر دروازے پر کھڑی کر دی تھی۔

اپنی محبت کا یقین دلا کر دونوں وہاں سے رخصت ہوئیں۔

ایک مفلوک الحال رشتے دار کی مدد کر کے دونوں ہی کو گھر اسکون قلب حاصل ہو رہا تھا۔

ٹیکسی جیسے جیسے وہاں سے دور ہوتی جا رہی تھی ویسے ہی وہاں سے لی ہوئی ساری ٹینشن بھی۔

ہزار ہزار کے وہ دو نوٹ شاہ جہاں چچا کی بیوی کی مٹھی میں پسینے میں بھیکتے رہے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی چند دن یہ قصہ وہ کہ باتوں میں آتا رہا۔

دونوں بہنوں کے شوہر غیر خاندانوں سے تھے۔ انہوں نے تو کوئی ایسی خاص دلچسپی اس ذکر میں نہیں لی لیکن کلفام بڑی دردمندی سے سن گئے۔

”کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم لوگ ان کے حالات سے کتنے بے خبر ہیں، حالانکہ ایک طرح سے سب کو اندازہ بھی ہے پھر بھی سب انجان بنے رہتے ہیں۔“ وہ تاسف سے کہتے ہوئے اٹھ گئے۔

کلفام اب سب کے بیچ بیٹھنا تقریباً ختم کر چکے تھے سب کے بلانے پر ذرا دیر کے لیے آتے اور پھر بے رخی کے ساتھ اٹھ جاتے، کھانا بھی زیادہ تر باہر کھانے لگے تھے، اور جن بھانجے، بھانجیوں سے وہ حد درجہ لاڈ بہا کر کرتے تھے، ان کو بھی مکمل طور پر نظر انداز کیے رکھتے۔

سب ہی سمجھ چکے تھے کہ وہ منہ سے نہیں کہہ رہے لیکن ناراض ہیں۔

نیلم کم بخت آئے دن ماں کے گھر آئی رہتی اور شام سے ہی اپنے میاں کے ساتھ گلی میں چل قدمی میں

مہوہ رہتی۔
 ”پہلے سے زیادہ اس کا رنگ صاف ہو چکا تھا اور
 آنکھوں کی نیلی جھلکلاہٹ اور بھی خیرہ کن۔
 صابرہ آپا محلے میں عادتاً ”زیادہ گھومتی تھیں“ ایک
 روز سامنا ہوا تو لپک کر گلے لگ گئی۔ بڑی محبت سے
 سب کی خیریت پوچھی اور گھر کی دیوار کے ساتھ کھڑی
 اپنے میاں کی پرانی گاڑی کو بڑے فخریہ انداز میں
 دکھایا۔
 ”چھپھوری پہلے دیکھ ہی کیا رکھا تھا۔“
 دونوں بہنوں کا دل اس کے ٹھاٹھ دیکھ کر جل کر
 خاک ہوا جا رہا تھا۔
 ”بس آیا اب جو بھی پہلی لڑکی ملے گلفام کا رشتہ
 پکا کر دو، بھیا کمزور دل ہے، ایسا نہ ہو اس نیلم کو دیکھ دیکھ
 کر کہیں دل پر اثر نہ لے لے۔“ چھوٹی شاکرہ کو سخت
 ہول اٹھ رہے تھے۔

ہماری سمجھ میں آگئی لڑکی تو پھر بات بھی کر لیں گے۔“
 صابرہ آپا کا ارادہ مستحکم ہوتا جا رہا تھا۔
 ”گلفام کو بھی ساتھ لے چلیں، وہ بھی دیکھ لیں
 گے تو پھر فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔“
 بات معقول تھی، مگر انہیں منظور نہ ہوئی۔
 ”پہلے ہم دیکھ لیں، لڑکی مناسب لگے گی تو اسے بھی
 دکھا دیں گے، سچ پوچھو تو مجھے اس کی سمجھ بوجھ پر ذرا بھی
 بھروسہ نہیں رہا، اس نیلم کے قصے کے بعد۔“
 ”خیر اب ایسی بری بھی نہیں تھی بے چاری!“ سر
 جھکاتے ہوئے وہ دھیرے سے کہہ ہی گئیں۔
 صابرہ نے خفگی سے بہن کی طرف دیکھا، مگر منہ
 سے کچھ نہیں بولیں۔
 اگلے دن جانے کا پروگرام پکا تھا۔



بادلوں بھری ایک دوپہر کو وہ ایک بار پھر اکبر اعظم
 کے غریب خانہ پر موجود تھیں۔
 خیال تھا کہ وہاں ان کی آمد کو حیرت سے دیکھا جائے
 گا، مگر ایسا کوئی اظہار کسی طرف سے بھی نہیں تھا، بلکہ
 انہیں لگا جیسے وہ لوگ ان کی آمد کے منتظر ہی تھے۔
 ”روز راہ دیکھتا تھا تمہاری پھر یہی سوچ کر تسلی دے
 لیتا کہ شاید ابھی فرصت نہیں ملی۔“
 اکبر اعظم بڑی شفقت سے کہہ رہے تھے، چارپائی
 کی حالت ابھی تک وہی تھی، لیکن گاؤں تکیے کا کور بدل
 دیا گیا تھا۔

باقی ان ڈیڑھ پونے دو مہینے میں برسوں کی خستہ حالی
 میں کون سا بڑا فرق پڑ جاتا تھا۔
 ”گھر سے کہاں نکلا جاتا ہے بڑے ابا! دس کام
 ہوتے ہی روزانہ۔“
 صابرہ کو ان کا چھوٹا سا شکوہ بھی برا لگا، غریب رشتے
 داروں کی تھوڑی سی حق جتاتی بے تکلفی بھی پن کی
 طرح چبھ جاتی ہے۔
 ان کی رکھائی محسوس کر کے ہی وہ چند لمحوں کے
 لیے خاموش ہو رہے تھے۔

صابرہ پر سوچ لگا ہوں سے اس کا چہرہ دیکھے جا رہی
 تھیں۔ ایک خیال ابھی ابھی اچانک ہی کہیں سے آیا
 تھا۔
 ”شاکرہ!“

ان کے لہجے میں عجیب سا تجسس تھا، لیکن شاکرہ
 کے لیے اب کچھ بھی نیا نہیں تھا، بہن کی مزاج آشنا
 تھیں۔
 ”چل کر بڑے ابا کی نو اسی کو نہ دیکھ لیں؟“ سنا ہے
 اب وہ مستقل یہیں آگئی ہے، ماں کے مرنے کے
 بعد۔“

”واقعی!“ دونوں کی آنکھوں میں چمک سی دوڑ گئی۔
 نور جہاں مرحومہ کی بیٹی واقعی ساری شرائط پر پوری
 اترتی تھی بلکہ ایک سو دس فیصد اترتی تھی۔
 ”اب اتنی جلدی دوبارہ چلے جائیں گے تو کہیں وہ
 سمجھ نہ جائیں کہ کسی خاص مقصد کے لیے آئے
 ہیں۔“

”کوئی بات نہیں لوگ لڑکیوں کو دیکھنے تو آتے ہی
 ہیں ہر گھر میں، اس میں کون سی انوکھی بات ہے۔“

بھالی پاس آئیں تھیں اور ان سے کچھلی ملاقات
میں سے دو ہزار روپوں کے بوجھ تلے احسان مندی سے
دلی جارہی تھیں۔
بکھی پنکھا تیز کرتیں، کبھی ان کے پیچھے تکیہ رکھنے
کی کوشش کرتیں۔

”سنا ہے نور جہاں آپ کی بیٹی آپ کے پاس آگئی ہے۔“
اب؟

ان دونوں کی متلاشی نگاہوں نے ایک نگاہ میں پورا
جائزہ لیے جانے والے اس گھر میں کسی اور کی موجودگی
کے آثار نہ پا کر مایوسی سے پوچھ ہی لیا۔
”ہاں دیکھیں تو ذرا ساری عمر تو کبھی نور جہاں آپ کو
آنے نہیں دیا اور اب وہ نہ رہیں تو اتنی بڑی ذمہ داری
ہمارے سر ڈال دی۔“

بھالی کی ناگواری بجا اور فطری تھی۔
”چلو کم از کم اتنا تو اطمینان ہوا کہ یہاں کوئی لڑکی
واقعی پائی جاتی ہے۔“ دونوں بہنوں کی تسلی ہوئی۔

اکبر اعظم شاید اپنی بہو کی بات سے شرمندگی
محسوس کر رہے تھے، گھر میں اب ان کی حکومت کا نام نہ
گزر چکا تھا، محلے والوں سے چاہے جتنا بھی لڑتے، بہو
بیٹے کے ساتھ بہت دے دے رہتے اس وقت
بھی ملے سے ”اللہ مالک ہے سب کا!“ کہہ کر خاموش
ہو رہے۔

”مہ رخ! اے مہ رخ! بھالی اٹھ کر صحن میں جا
کھڑی ہوئی تھیں اور چھت کی طرف دیکھتے ہوئے
آوازیں لگا رہی تھیں۔

”کپڑے اتارنے کے لیے اوپر بھیجا تھا“ وہیں کی
ہو رہی، میرا تو دل ہر وقت ڈرتا رہتا ہے، جوان لڑکی ہے
اب میں مستقل پیچھے پیچھے پھرنے سے تو رہی۔“ وہ
بولے جارہی تھیں۔

صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ہاتھ آئے اس مفت کے
ثواب کو کمانے میں ذرا بھی دلچسپی نہیں رکھتی تھیں۔
”ایسا کیا ہے اوپر، جو نیچے آنے کو دل ہی نہیں چاہ
رہا۔“ اوپر سے آئی مہ رخ کو دیکھ کر انہوں نے خاصا

ٹھیک ٹھاک طنز کیا۔

تمہ ہوئے کپڑوں کا ڈھیر سنبھالے ہوئے وہ چپ
چاپ سیڑھیاں اترتی نیچے آچکی تھی۔

سیڑھیاں آڑ میں تھیں، اور سر پر دوپٹہ ہونے کی
وجہ سے اب تک بھی دونوں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی
تھیں۔

”مہ رخ بیٹا! مہرودھر آ بیٹا!“ بھالی کی تلخی کا ازالہ
شاید وہ اسی طرح کرتے تھے۔

”جی نانا!“ دھیرے سے کہتی ہوئی، وہ ان کے دھیرو آ
کھڑی ہوئی۔

زیریں مائل سانولی رنگت، عام سے نقوش اور
دبے دھبے ہاتھ پاؤں۔

یہ بھی مہ رخ عرف مہو۔
چہرے پر شیمی کا سسم اور حالات کا بخشا ہوا احساس
کمتری۔

بے حد مایوسی کے ساتھ ان دونوں نے ایک
دوسرے کو دیکھا۔

”ہمارے ہاں واقعی ناموں کا مذاق ہی چلا آ رہا
ہے، کہتا تو کلفام ٹھیک ہی ہے۔“

پہلی بار صابرہ آپا دل ہی دل میں بھالی سے متفق
ہوئیں۔

نئی بات تو یہ کہ لڑکی انہیں خود بھی نہیں بھالی تھی،
نیلیم جیسی پر بیمار لڑکی کے بعد انہیں بیس تو چل سکتی
تھی۔ مگر یہاں تو سرے سے مقابلہ ہی نہیں تھا۔

”جیتی رہو، ٹھیک ہو؟“ سرسری سے انداز میں
انہوں نے مہ رخ کے سلام کو نمٹایا۔

خواجخواہ ہی آج یہاں تک کی دوڑ لگائی، انہیں
ٹیکسی پر خرچے پیسوں کا افسوس ہو رہا تھا۔

”کلفام میاں کی بہنیں ہیں۔ سارے بہن بھالی
ایک سے خوش مزاج ہیں، اللہ انہیں ہمیشہ خوش
رکھے۔“

اکبر اعظم بڑی محبت سے مہ رخ کو بتا رہے تھے، مگر
ان دونوں کو بڑا عجیب سا لگا، کلفام کا ذکر بڑا بے جوڑ

اکبر اعظم بڑی محبت سے مہ رخ کو بتا رہے تھے، مگر
ان دونوں کو بڑا عجیب سا لگا، کلفام کا ذکر بڑا بے جوڑ

تھا۔

”سخ کے اداس چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ“
کمرے میں کرن کی مانند چمکی اور معلوم نہیں کیوں وہ
ذرا ”ہی اندر چلی گئی۔“

دونوں بہنیں اپنی تمام سمجھ داری کے باوجود نہ اس
مسکراہٹ کا مطلب سمجھیں اور نہ ہی اس کے اندر
چلے جانے کا۔

تب ہی بیرونی زنگ خوردہ دروازہ کھل جاسم سم کے
سے بھید بھرے انداز میں کھلتا چلا گیا۔

ایک ہاتھ میں پھلوں کا بڑا سا شاہر اور دوسرے میں
نہ جانے کیا اٹھائے گلفام اندر داخل ہوئے تھے۔

دونوں بہنوں کو دیکھ کر وہ اس طرح مسکرائے جیسے
انہیں خبر تھی کہ وہ دونوں یہاں ملیں گی۔

”کیوں یہ تکلیف کرتے ہو بیٹا! ہمارے لیے تو
تمہارا سہارا ہی بہت ہے“ مت شرمندہ کرو اس

طرح۔“
اکبر اعظم جو آج ان دونوں کے رویہ میں کچھ جھین

سی محسوس کرتے ہوئے اندر ہی اندر اداس ہو رہے
تھے توجہ کے اس انداز پر آب دیدہ ہونے لگے۔

”اب آپ نے ایسے کہا“ تو میں واقعی ناراض
ہو جاؤں گا بڑے ابا!“ گلفام شاہر سامنے بچن میں

رکتے ہوئے کہتے آرہے تھے۔
صاف صاف سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ اس گھرانے

سے پوری طرح مانوس ہو چکے ہیں۔
”میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ میری بڑی بہنیں

آپ کے پاس درخواست لے کر آنے والی ہیں“ تو دیکھ
لیجئے وہ آگئیں۔“

اکبر اعظم کے شانوں کو تھامتے ہوئے وہ ان کے
قریب بیٹھ چکے تھے۔

دونوں بہنوں نے بہت بے یقینی کے ساتھ ان کی
طرف دیکھا تو گلفام نے بڑی ملائمت کے ساتھ

رضامندی کا اشارہ کیا۔
ان کے چہرے پر ایسی بھرپور مسکراہٹ تھی جو

اطمینان قلب کا پتہ دیتی تھی۔

ان کا اتنا قابل بھائی، شریف، صاحب جائیداد
اور۔

ان کی نگاہ نیم اندھیرے کمرے کی طرف گئی، جہاں
مہ رخ کم ہوئی تھی۔

مخالفت کی ایک تند سی لہر ان کے دل و دماغ میں
اٹھی اور پھر دوسرے ہی لمحے دم توڑ گئی۔ انہوں نے

اکبر اعظم کی طرف دیکھا۔ جن کے سر اور داڑھی میں
اب ایک سیال بھی کالا نہیں رہ گیا تھا۔

اور جن کے چہرے کی جھریوں میں آنسو چمک رہے
تھے۔

صابرہ آبا کے دل کو پتہ نہیں کیا ہونے لگا۔ وہ اپنی
جگہ سے اٹھیں اور جا کر اکبر اعظم کا نحیف ہاتھ تھام

لیا۔
”ہماری درخواست کو قبول کیجیے گا بڑے ابا!“ نہیں

اپنی آواز میں آنسوؤں کی نمی کھلتی ہوئی خود محسوس
ہوئی۔

”میں ٹھیک ہی کہتا تھا نا کہ ہمارے خاندان میں بڑا
سخت گزیر رہا ہے ناموں کا۔“ گہری ہوتی شام میں وہ

تینوں بہن بھائی ٹیکسی میں واپس گھر جارہے تھے تو
گلفام خوشی سے لبریز لہجے میں بہنوں سے کہہ رہے

تھے۔
”چھا بھلا شخص بھی دھوکا کھا سکتا ہے نام کے چکر

میں مگر سچی بات ہے، ہمیں تو اب مزا آنے لگا ہے ایسا
کنفیوژن پھیلا کر۔“

اپنی بات کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑے۔ دونوں
بہنیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

”لیکن میرا خیال مختلف ہے، یہ صرف سمجھ کا پھیر
ہے ورنہ مہ رخ واقعی مہ رخ ہے“ اکبر اعظم، اکبر

اعظم ہے اور تم!“ صابرہ آبا نے بہت محبت سے بھائی کی
طرف دیکھا۔

”تم تو ہو ہی شہزادہ گلفام میرے بھیا!“
ایک اجلی دلوں کو منور کرتی روشنی، ان تینوں کے

ساتھ سفر کر رہی تھی۔

